آسمان
عبّاس تابش

فہرست

غـــزلـــیں

نظمیں

سُخن سرائے سے ایک خط

میں تمہارے بعد ایک طویل خود کلامی میں کھو گیا تھا۔ نہ میرا آئینے سے ربط رہا نہ مِلنا سے گفتگو۔ ایک دن میں نے سوچا کہ محبت محض ناکامی کا نام تو نہیں۔ اس سے ملنے والے دُکھ کبھی کبھی دُنیا داری بھی سکھا دیا کرتے ہیں۔ مجھے دعویٰ تو نہیں لیکن میں نے بساط بھر دُکھوں سے جینے کا حوصلہ حاصل کیا۔ ایک موقع پر میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر تلخی پیدا ہو گئی ہے اور میں منفی سوچ کا حامل ہوتا جا رہا ہوں۔ یوں لگا جیسے محبت کی نارسائیاں دنیا سے ناراضی کا سبب بن گئی ہیں۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ تم سے قطعِ تعلق کر لوں اور پوری طرح عارفِ دُنیا بن جاؤں۔ یہ کیفیت طویل تر انتظار کے دوران پیدا ہوئی۔ اس کے زیرِ اثر میں نے تمہارے متعلق نہ جانے کیا کیا سوچا۔ تم سے جتنی محبت تھی اس سے بڑھ کر نفرت کی۔ لیکن جب تمہیں سامنے پایا تو نہ تم سے شکوہ تھا نہ شکایت۔ مجھ میں جس قدر تلخی تھی وہ تمہارے انتظار نے پیدا کی اور تم نے ختم کر دی۔ یہ تلخی بھی شاید محبت کی کوئی جہت تھی۔ تلخی کا ذکر اس لیے ابتدا میں آگیا کہ میں آجکل اسی کیفیت سے گذر رہا ہوں۔ ہر چند میں نے تمہارے انتظار کی شدت کو کم کرنے کے لیے اوروں سے پیار کیا۔ لیکن پسِ عمرِ رواں جو غم ٹھہر گیا ہے وہ مہ و سالِ زندگانی کے ساتھ کسی طور جانے کو تیار نہیں۔ یہ غم سورج کی طرح طلوع ہوتا ہے اور اپنی تمازت سے

ویرانۂ جاں میں وہ کشش پیدا کرتا ہے جو مجھے مجھ سے دُور نہیں ہونے دیتی۔ میں جس غم کی بات کر رہا ہوں یہ شاید میرا بنیادی موضوع ہے۔ اس غم نے سماجی عمل کے اُتار چڑھاؤ خود میں ڈھال لیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہر واقعے کو ایک جیسی شدت سے محسوس کرنے لگا ہوں۔

تمہیں شاید یاد ہو کہ یہ غم تم نے مجھے گورنمنٹ کالج لاہور میں کیفے ٹیریا کے ساتھ گراؤنڈ میں سرما کی دھوپ سینکتے ہوئے کسی بے خیالی کے لمحے میں دیا تھا۔ یہ ایک لمحہ میری زندگی پر محیط ہو گیا ہے۔ یہ لمحہ نہ میرا ماضی ہے نہ حال نہ مستقبل۔ یہ کوئی اور زمانہ ہے جو کئی زمانوں سے میرے ساتھ ساتھ ہے۔ اِسی کے زیرِ اثر میں شعر کہتا ہوں۔ اس لمحے سے پہلے تک میں نے جو شاعری کی وہ حاصلِ مطالعہ تھی جس میں کہیں کہیں میں خود بھی تھا۔ لیکن بعد میں مَیں بھی بدل گیا اور میری شاعری بھی ..... تجربہ میرے سامنے آ گیا۔ اب مَیں قافیے کا امکان اپنی کیفیات کے جھاڑ جھنکار سے ڈھونڈنے لگا۔ کچھ عرصہ تک تو مجھے یُوں لگا جیسے میں اظہارِ سخن میں فوری ردِعمل کا شکار ہوں۔ جو مجھ پر گذرتی ہے کہہ دیتا ہوں۔ جی کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے یا تمہیں سنانے کے لیے..... آخر تم سے باتیں بھی تو کرنا تھیں کیونکہ میرے نزدیک محبّت کا جذبہ بھی روحانی تجربے کی طرح یا تو نگاہوں سے عیاں ہوتا ہے یا شاعری کی زبان میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ میں شاعر تھا اس لیے سُخن کی زبان میں تم سے تکلم کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن کہیں کہیں سکوت کا وقفہ آیا۔ اس دوران میں نے زبردستی شعر کہنے کی بجائے شاعرانہ کیفیت کو انگیز کیا۔

اب تم سے بچھڑے زمانہ ہو گیا ہے جو باتیں میں تم سے کیا کرتا تھا اب خود سے کر رہا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میری شاعری میں خود کلامی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس خود کلامی نے مجھے روحانی مطالبات پر توجہ کا متحمل بنایا۔ اب یہ عالم ہے کہ خود سے کبھی اپنی باتیں کرتا ہوں اور کبھی تمہاری..... یہی سلسلہ میری شاعری کا سفر قرار پاتا ہے۔

اس میں کہیں کہیں دنیا اور اُس کے غم بھی در آتے ہیں لیکن اُسی طرح جیسے تم اور تمہارا غم.......!

تمہیں علم ہے کہ ہماری محبت میں موضوعی فقدان کبھی نہیں رہا تم نے کبھی کسی اور موضوع کو محبت سے فرار نہیں سمجھا۔ ویسے بھی محبت کرنے والے لوگ دیگر معاملات پر محبت کے نقطۂ نظر ہی سے بات کرتے ہیں اس لیے دنیا کے غم کو "کسی" کا غم بنا لیتے ہیں۔ یہ بہت پرانی بات ہے لیکن ہے سچ! میں نے دنیا سے معاملات میں بہت دھوکے کھائے ہیں۔ جب مجھے کوئی دستِ مہربان نہ ملا تو میں نے درختوں کو دستِ مہرباں سمجھنا شروع کر دیا اور اُن سے ایسوسی ایشن قائم کی۔ تم نے ایک دفعہ کہا تھا کہ میری شاعری میں پرندے درخت ہوا، چاند اور صُبح کا ذکر تم سے زیادہ ہے۔ معلوم نہیں تم نے ان لفظوں کی تہہ میں میرے غمِ مستقل تک کیوں نہ رسائی حاصل کی....

یہ لفظ تمہارے رقیب نہیں ہیں۔ یہ لفظ وہ رنگ ہیں جن سے میں اپنی کیفیات کو پینٹ کرتا ہوں اور محبت کے فرض سے عہدہ برآ ہوتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں اوّل و آخر محبت کرنے والا ہوں۔ محبت میری زندگی ہے اور زندگی کو پیش کرنا شاعری! میرے نقادوں نے مجھے محبّت کی شاعری کرنے سے روکا۔ کہا کہ اس پر بہت شاعری ہو چکی ہے اب اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہو سکتا ہے وہ سچ کہتے ہوں لیکن میں اپنی ذات کے سچ (محبّت) کو موضوع بنانے سے کیسے باز رہ سکتا ہوں بعض اوقات تو مجھے یوں لگتا ہے میں نے شاعری میں محبت کی ہے اور محبت میں شاعری۔

تم سے بچھڑے زمانہ ہو گیا ہے لیکن آج بھی تم سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔ دوستوں کا کہنا ہے کہ میری شاعری میں ہجر کا مسئلہ نہیں آتا۔ میں نے اس پر بہت غور کیا کہ تم نہیں ہو لیکن تمہاری کمی مجھے محسوس نہیں ہوتی۔ شاید میں نے تمہیں کبھی خود سے جدا نہیں سمجھا۔ چلتے کو موڈ کرے تو دو کپ بناتا ہوں ایک اپنے لیے اور دوسرا تمہارے لیے۔ میں

نہیں چاہتا کہ وصال کا موسم گزر جاتے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے قرب کا دن ڈھل جائے اور میری زندگی میں وقتِ شام و سحر آجاتے۔ آجکل تو یہ کیفیت ہے کہ جب بھی تم سے ملنے کو جی کرتا ہے شعر کہنے لگتا ہوں۔ اسی لیے غزل میں تخاطب کا انداز پیدا ہوتا ہے کبھی تم سے مکالمہ کرتا ہوں اور کبھی خود سے . . . . جس طرح محبت کارِ مسلسل ہے، اُسی طرح شاعری بھی ایک مسلسل عمل ہے۔ اس کا بھی "جو دَم غافل سو دم کافر" والا معاملہ ہے۔ میں ان دونوں کے سلسلے میں کبھی غافل نہیں ہوا . . . . یار لوگ مجھے زود گو کہہ کر میری محنت یعنی محبت کو اکارت کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں کیسے بتاؤں کہ محبت اور شاعری دونوں میرے سانس کی طرح ہیں۔ میں سانس آخر کب تک روک سکتا ہوں؟ . . . زود گوئی کی مخالفت کرنے والے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اس سے یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ میرے ہاں یہ معاملہ نہیں اسس لیے میں کبھی پریشان نہیں ہوتا۔ میری ہر تازہ غزل اتنی مختلف ضرور ہوتی ہے کہ اُس پر سنی ہوئی غزل کا گمان نہیں گزرتا۔ جیسے تم سے ہر ملاقات اجنبیت سے شروع ہوتی ہے اُسی طرح ہر نئی غزل کے دوران میری نو آموزی جاگ اُٹھتی ہے یوں لگتا ہے پہلی بار غزل کہہ رہا ہوں۔

تم نے ایک دفعہ میری روایت پسندی کے بارے میں بات کی تھی اور اِدھر اُدھر کے اعتراضات پر استفسار کیا تھا۔ تم نے پوچھا تھا کہ میں محبت اور شاعری دونوں میں روایت پسند کیوں واقع ہوا ہوں۔ اُس وقت تو میں نے کوئی جواب نہ دیا تھا لیکن اب مناسب سمجھتا ہوں کہ تمہارے اس سوال کا جواب بھی دیتا چلوں۔ میرے نزدیک شاعری خود رَد پودا نہیں۔ کیا تم نے کوئی ایسا خود رَو پودا دیکھا ہے جو قد آور ہو اور کوئی قابلِ ذکر پھل بھی دیتا ہو پھلدار درخت زیادہ تر پیوند کے محتاج ہوتے ہیں۔ پھلوں کی مٹھاس میں اضافے کے لیے پیوند کاری کی جاتی ہے۔ میں شاعری میں اسی کا قائل ہوں۔ جب میں پیوند لگا رہا تھا لوگوں نے مجھ پر روایتی ہونے کا الزام لگایا۔ لیکن جب پھل آنے لگا تو

وہی لوگ اپنی رائے بدلتے نظر آتے۔ میں بھی چاہتا تو بحور میں زحافات کی کمی بیشی اور مخصوص شعری لغت سے اپنی محدود انفرادیت قائم کرتا لیکن میں نے ایسا نہ کیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے کچھ نوجوان سامنے آتے انھوں نے اپنی انفرادیت کے زیرِ اثر دو چار چونکا دینے والی غزلیں کہیں اور چلتے بنے اب تم خود فیصلہ کرو کہ کیا فرق ہے ان نوجوانوں اور خُود رَد پودوں میں . . . .

میرے خیال میں غزل کی شاعری روایت اور تجربے کے توازن کا نام ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ "آسمان کی شاعری میں یہ کام کر پایا ہوں لیکن ایسا کرنے کی حتی المقدور کوشش ضرور کی ہے۔ پس عمرِ رواں ٹھہرے ہوتے غم میں مجھے اتنی پرتیں نظر آرہی ہیں کہ اسس کو سخن میں ڈھالنے کے لیے ایک عمر شاید کم ہو۔ میں نے اس غم کی صداقت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ میں نے اسس پر غیر موزوں لفظوں کی ملمع کاری کر کے اپنے قاری کو خواہ مخواہ مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کی۔

میرے ایج گروپ سے قبل کے شعرا نے لفظی بازی گری میں خود کو خرچ کیا خود بھی گمراہ ہوتے اور ہمارا بھی وقت ضائع کیا۔ ان شعراء نے محض لہجے کا لُطف پیدا کرنے پر توجہ دی، نفسِ مضمون سے گریز کرتے رہے۔ اس دو رُخی نے انہیں اُلجھا دیا یہی وجہ ہے کہ ایک آدھ کتاب کے بعد ان کی ہمت جواب دے گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اساطیری علامتوں کا جواز اپنی زندگیوں میں ڈھونڈے بغیر انہیں استعمال کیا اسس لیے وہ اپنی مخصوص اور منفرد شعری لغت سے زیادہ کام نہ لے سکے۔ ان میں سے کچھ شعراء نثری نظم کی طرف نکل گئے اور کچھ نے غزل میں کافی کا آہنگ پیدا کرنے کی کوشش کی اور کچھ بحور میں توڑ پھوڑ تک محدود ہو گئے ان شعراء پر لکھی جانے والی تنقید بھی ٹائپ فقروں سے آگے نہیں بڑھ سکی۔

تم یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہیں بھول کے کسی اور طرف نکل گیا ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں۔

"گفتگو کسی سے ہو دھیان تیرا رہتا ہے" یہ دھیان ہی ایسی متاع ہے جس پر میری نسل کے شعراء کا اعتماد ہے۔ وہ اس دھیان سے اپنے سخن کا چراغ جلاتے ہیں۔ وہ تہ در تہ زندگی کو تہ در تہ انداز میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان میں کچھ نوجوان شعراء ایسے تھے جو اساطیری علامات کے تجربے میں گھر گئے۔ لیکن انہیں بھی جلد احساس ہو گیا کہ شاعری میں نیا تجربہ ناکام ہو گیا ہے۔ اس طرح غزل بھی جدید افسانے کی طرح تجریدیت سے نکل آئی۔ اب غزل میری نسل کے شعراء کے ہاتھ میں ہے جن کے ہاں اظہار کی سادگی اور موضوعات کا تنوع ہے۔ وہ ذوق کی طرح مصرع کی صفائی ستھرائی پر ہی خرچ نہیں ہوتے بلکہ غالب کی پیروی میں مضمون آفرینی کا ڈول بھی ڈالتے ہیں۔

میں پھر اپنی خود کلامی کی طرف لوٹتا ہوں۔ تم میری کتاب پڑھو اور دیکھو کہ میں نے تمہیں اور تمہارے دیئے ہوئے غم کو کیسا کتاب کیا ہے۔ اچھا لگے تو ضرور داد دینا کہ تم وہ "شاعر گر" ہو جسے سخن شناسی میں بھی کمال حاصل ہے۔ اسی لیے تو تم سے مخاطب ہونا اچھا لگتا ہے۔

تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے جب اپنی نئی کتاب کا نام "آسمان" تجویز کیا تو تم نے کہا "تمہید" کے بعد "آسمان" کیوں؟ آسمان تمہارا نام تھا۔ جو میں نے اپنی کتاب کو دے دیا۔ آسمان تم ہو۔۔۔۔۔ آسمان نارسائی کا استعارہ ہے۔۔۔۔ آسمان کی طرف دیکھنا یعنی تمہاری طرف دیکھنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ میں تمہارے لیے بہت سا سفر طے کر چکا ہوں لیکن تم ابھی تک تغافل کی بلندی پر ہو۔ چلے آؤ کہ میں نے نئے مکان میں تمہارے لیے درِ انتظار رکھ دیا ہے۔ اس مکان کو گھر بنا دو کہ مکان اپنے مکین کی وجہ سے گھر بنتا ہے۔ مجھے بارش اور تازہ غزل کی طرح تمہارا انتظار رہے گا۔

تمہارا

عباس تابش، ۲۷ اگست ۱۹۹۱ء

یہ اُسکی مرضی ہے آتے نہ خاکداں کی طرف
ہمیں تو دیکھتے رہنا ہے آسماں کی طرف

جلنے والے نے کہا جی کو بُرا مت کیجئے
اس سے بہتر ہے کوئی اور محبّت کیجئے

تُو جو ہر بات پہ دیتا ہے پرندوں کی مثال
اس کا مطلب ہے، ترے شہر سے ہجرت کیجئے

○

یہ عجب ساعتِ رُخصت ہے کہ ڈر لگتا ہے
شہر کا شہر مجھے رختِ سفر لگتا ہے

ہم کو دِل نے نہیں حالات نے نزدیک کیا
دُھوپ میں دُور سے ہر شخص شجر لگتا ہے

جس پہ چلتے ہوئے سوچا تھا کہ لوٹ آؤں گا
اب وہ رستہ بھی مجھے شہر بدر لگتا ہے

مُجھ سے تو دِل بھی محبّت میں نہیں خرچ ہُوا
تم تو کہتے تھے کہ اس کام میں گھر لگتا ہے

وقت لفظوں سے بنائی ہوئی چادر جیسا
اوڑھ لیتا ہوں تو سب خواب ہُنر لگتا ہے

ایک مُدت سے مری ماں نہیں سوئی تابشؔ
میں نے اک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

○

عشق ہی کارِ مسلسل ہو گیا
زندگی کا مسئلہ حل ہو گیا

میرے آنسو میرے اندر ہی گرے
رونے سے جی اور بوجھل ہو گیا

آسماں پہلے نہیں تھا بے ستوں
لیکن اب دستِ دُعا شل ہو گیا

میں نے بھی اُس کو بُھلایا اور پھر
خوش ہُوا اتنا کہ پاگل ہو گیا

پانیوں پر آخری ہچکی کے ساتھ
ایک افسانہ مکمل ہو گیا

برف کے پیڑوں پہ پھول آنے لگے
رابطہ اُس سے معطل ہو گیا

گھومتا پھرتا ہے تنہا رات کو
سردیوں کا چاند پاگل ہو گیا

تابشؔ اب تو سو ہی جانا چاہیے
سامنے کا گھر مقفل ہو گیا

○

مکاں بھر ہم کو ویرانی بہت ہے
مگر یہ دل کہ سیلانی بہت ہے

ہمارے پاؤں اُلٹے ہیں سو ہم کو
پلٹ جانے میں آسانی بہت ہے

ستارے چور آنکھوں سے نہ دیکھیں
زمیں پر میری نگرانی بہت ہے

ابھی سُوکھی نہیں مٹی کی آنکھیں
ابھی دریاؤں میں پانی بہت ہے

عجب سی شرط ہے یہ زندگی بھی
جو منوائی ہے کم مانی بہت ہے

ضرورت ہی نہیں دشمن کی تلاش
مجھے میری تن آسانی بہت ہے

○

طلسمِ خواب سے میرا بدن پتھر نہیں ہوتا
مری جب آنکھ کھلتی ہے میں بستر پر نہیں ہوتا

یقیں آتا نہیں تو مجھ کو یا مہتاب کو دیکھو
کہ رات اس کی بھی کٹ جاتی ہے جس کا گھر نہیں ہوتا

جدھر دیکھوں ادھر ہی دیکھتا رہتا ہوں پہروں تک
مجھے اطراف کا خالی ورق ازبر نہیں ہوتا

کھجوریں اور پانی لے کے آگے بڑھتا جاتا ہوں
مگر یہ کوہِ امکاں ہے کہ مجھ سے سر نہیں ہوتا

کم از کم مجھ سے دُنیا کو شکایت تو نہیں ہو گی
میں اُس جیسا ہی بن جاؤں اگر بہتر نہیں ہوتا

جواز اپنا بناتا ہوں کسی نادیدہ خطّے میں
جہاں میری ضرورت ہو وہاں اکثر نہیں ہوتا

بہاتا ہوں کہیں اپنے سفالِ بے مُرکب کو
میں گریہ کے دِنوں میں چرخِ دُنیا پر نہیں ہوتا

گلہ تو خیر کیا ہو گا بس اتنا تُم سے کہنا ہے
تمہاری عُمر میں کوئی ستم پرور نہیں ہوتا

تو پھر یُوں ہے کہ میں نے اُسکو چاہا ہی نہیں تابش
اگر اُس کی شباہت کا گماں مجھ پر نہیں ہوتا

○

خمیدہ سر نہیں ہوتا میں خودداری کے موسم میں
مرا اک اپنا موسم ہے گرانباری کے موسم میں

میں ان گرہوں میں پانی باندھ کر لایا تھا دریا سے
مرے چہرے پہ آنکھیں تھیں عزاداری کے موسم میں

ہمارے کھلنے اور جھڑنے کے دن اک ساتھ آئے ہیں
ہمیں دیمک نے چاٹا ہے شجر کاری کے موسم میں

کہیں باہر کی زنجیریں نہ اندر تک پہنچ جائیں
گرفتہ دل نہیں ہونا گرفتاری کے موسم میں

تمنّا میں فراغت کا کوئی لمحہ نہیں ملتا
بڑی مصروفیت رہتی ہے بیکاری کے موسم میں

سیاست سے محبّت کا کوئی رشتہ نہیں آتا
کسی کے ہم بھی ہو رہتے طرفداری کے موسم میں

بہر صورت عزائم اور بال و پر بچانے ہیں
وگرنہ ہم نہیں تابشؔ کمانداری کے موسم میں

○

ہمیں پچھاڑ کے کیا حیثیت تمہاری تھی
وہ جنگ تم بھی نہ جیتے جو ہم نے ہاری تھی

اور اب تمہیں بھی ہر اک شخص اچھا لگتا ہے
گئے دنوں میں یہی کیفیت ہماری تھی

ہمارے چہرے دمِ صبح دیکھتے آ کر
کہ ہم نے رات نہیں زندگی گذاری تھی

بچھڑ گیا وہ جدائی کے موڑ سے پہلے
کہ اس کے بعد محبت میں صرف خواری تھی

○

دیوارِ پیش پا کا ہُنر دے دیا گیا
دُشمن کو میرے ساتھ کا گھر دے دیا گیا

بارش سی ہوتی رہتی ہے بارش کے بعد بھی
رہنے کو آبدیدہ شجر دے دیا گیا

اب کون سیرِ ماہ کرے رات رات بھر
ہر خانماں خراب کو گھر دے دیا گیا

○

پرندے پوچھتے ہیں تُم نے کیا قصور کیا
وہ کیا کہیں جنہیں ہجرت نے گھر سے دُور کیا

یہی بہت ہے کہ اس عہدِ بے پیمبر میں
کہیں چراغ کہیں خواب نے ظہور کیا

یہ میرا خاک میں ملنا بسا غنیمت ہے
کہ میں نے عجز کی خاطر بہت غرور کیا

فلک سے پھینک کے دیکھا کہ ٹوٹنے کا نہیں
گرا کے اپنی نگاہوں سے چُور چُور کیا

غبارِ در بدری جس نے کر دیا مجھ کو
مسافروں کو اُسی دھوپ نے کھجور کیا

○

ہمیں تو خاک پہ حکمِ سفر دیا اُس نے
وہ اور ہوں گے جنہیں کوئی گھر دیا اُس نے

وہی کہ جس نے عطا کی گلاب کو خوشبو
مجھے بھی شوقِ اذیت سے بھر دیا اُس نے

اُسے نہ ملنے سے خوش فہمیاں تو رہتی ہیں
میں کیا کروں گا جو انکار کر دیا اُس نے

دُعائے ابر کا مقصد تو اور تھا کوئی
مرے چراغ کو پانی سے بھر دیا اُس نے

میں ایک شاخِ مسلسل نُما اپنے خوابوں کی
ثمر کے بوجھ سے بیکار کر دیا اُس نے

مری نگاہ کو کوئی فریب بھی دیتا
اگر یہ سچ ہے کہ حُسنِ نظر دیا اُس نے

○

کہیں چراغ کہیں چشمِ تر حوالہ ہے
ہر اک حوالہ مرا معتبر حوالہ ہے

تمہارے ساتھ محبت پہ گفتگو کیا ہو
تمہارا دشت ہے اور میرا گھر حوالہ ہے

یہ دوست بھی مری پہچان میرا چہرہ ہیں
اک اور بھی پسِ دیوار و در حوالہ ہے

میں اُس قبیلۂ وحشی سے ہوں کہ جس کا یہاں
قیام ہوتے ہوئے بھی سفر حوالہ ہے

دھنک کے رنگ، گُلِ ماہتاب کی خُوشبو
تمہارے جسم سے منسوب ہر حوالہ ہے

مرے تو زخم سے سورج مکھی نکل آیا
ترے ستم کا یہی معتبر حوالہ ہے

کہیں میں کام کہیں صرف نام ہوں تابشؔ
کہیں طویل کہیں مختصر حوالہ ہے

○

یہ جو اُس سے مجھے محبّت ہے
اِک ضرورت بلا ضرورت ہے

اپنی تعریف سُن نہیں سکتا
خُود سے مجھ کو بلا کی وحشت ہے

یہ مرا یونہی بولتے رہنا
اَن کہی بات کی وضاحت ہے

میں بھی شاید اُسے گزار سکوں
زندگی عرصۂ ندامت ہے

اپنی تلوار تیز رکھتا ہوں
جانے کس سے مجھے عداوت ہے

بات ابھی کی ابھی نہیں ہے یاد
ایک لمحے میں کتنی وسعت ہے

دُکھ ہُوا آج دیکھ کر اُس کو
وہ تو ویسا ہی خوبصورت ہے

ہم تو اک دوسرے میں رہتے ہیں
کیسی دُوری ہے! کیسی قربت ہے!

نیم خوابی کا کیا کروں تابش
نیند بھی رتجگے کی صورت ہے

○

اُس کا خیال خواب کے در سے نکل گیا
پھر میں بھی اپنے دیدۂ تر سے نکل گیا

پلکیں بھی بہہ گئیں خس و خاشاک کی طرح
میں اپنے ساحلوں کے اثر سے نکل گیا

تنہائی سے تھی میری ملاقات آخری
رویا اور اُس کے بعد میں گھر سے نکل گیا

جب شمعِ انتظار اُٹھا لی منڈیر سے
دستِ ہوا بھی حلقۂ در سے نکل گیا

رستے میں آنکھ تھی سگِ مامور کی طرح
دل میں جو چور تھا وہ کدھر سے نکل گیا

اب لے لے مجھکو اپنی ہتھیلی کی اوٹ میں
میرا ستارہ بُرجِ سفر سے نکل گیا

میرے ہی ساتھ گھر میں نظر بند تھا تو پھر
تیرا خیال کون سے در سے نکل گیا

○

دیوار ہے کسی کی دریچہ کسی کا ہے،
لگتا ہے گھر کا گھر ہی اثاثہ کسی کا ہے

اک اور ہاتھ بھی ہے پسِ رقصِ حیلہ جُو
ہم تُم تو پُتلیاں ہیں تماشا کسی کا ہے

یہ جو ہیں میرے پاؤں کسی اور کے نہ ہوں
چل میں رہا ہوں نقشِ کفِ پا کسی کا ہے

اشکوں سے بھر رہا ہوں میں اپنی دریدہ مشک
اتنے برس کے بعد بھی دریا کسی کا ہے

کیسے کہوں کہ اپنی زباں بولتے ہیں ہم
الفاظ لاکھ اپنے ہوں لہجہ کسی کا ہے

ممکن نہیں کہ بھیک بھی گھر لے کے جائیں ہم
تابش ہمارے ہاتھ میں کاسہ کسی کا ہے

○

پھر بھٹکتا پھر رہا ہوں ہجر موسم کے لیے
یہ زیادہ کھو دیا میں نے کسی کم کے لیے

اس جہانِ خاک سے جو بھی تعلق ہو مرا
زندہ رہنا ہے مجھے اُس ربطِ مبہم کے لیے

ایک ممنوعہ شجر کے ساتھ کاٹے زندگی
جرم جیسی یہ سزا ہے آلِ آدم کے لیے

اس کا مطلب ہے یہاں اب کوئی آئے گا ضرور
دم نکلنا چاہتا ہے خیر مقدم کے لیے

چھَن رہی ہے دھوپ سی دیوارِ جاں کے اُس طرف
میں بھی اب موزوں نہیں شاید ترے غم کے لیے

اس خزاں میں بھی وہی کاغذ کے پرزے جوڑ کر
اک شجر میں نے بنایا اپنے موسم کے لیے

خواب میرے یوں ہیں تابش جس طرح پانی پہ نقش
یہ شگون اچھا نہیں ہے دیدۂ نم کے لیے

○

ساحلوں پر مثلِ گوہر پھینک دے
اب تو مجھ کو اے سمندر پھینک دے

یہ جو گردش سی ہے میرے پاؤں میں
جانے کب بیرونِ محور پھینک دے

اے کسی کے شاخ سے نازک بدن
کوئی تازہ پھول ہم پر پھینک دے

دیکھ اپنے سامنے تُو ہی نہ ہو
ہاتھ سے اپنے یہ پتھر پھینک دے

کوئی اندر کی گھٹن کا بھی علاج
گالیاں کاغذ پہ لکھ کر پھینک دے

شاید اُس کے شور پر ہی شور ہو
کانچ کا برتن زمیں پہ پھینک دے

پھول کی گٹھڑی گرا دی شاخ نے
یوں نہ ہو یہ جسم بھی سر پھینک دے

○

زمیں کے نیچے کوئی شے تھی آسماں کی طرح
میں اپنے پاؤں پہ کیا ٹھہرتا مکاں کی طرح

عجیب دھوکے دیئے عشق کی ضرورت نے
لگا شجر بھی مجھے دستِ مہرباں کی طرح

یہ تیرا دھیان کسی وقت کام آئے گا
ابھی لپیٹ کے رکھا ہے بادباں کی طرح

نہ میرے سر سے سرکتا نہ چھاؤں دیتا ہے
یہ کون مجھ پہ مسلّط ہے آسماں کی طرح

یہ جان کر کہ بالآخر تو مجھ کو گرنا ہے
میں خستگی کو چھپاتا رہا مکاں کی طرح

مرے ہی گھر میں مرا معتبر حوالہ ہے
کہیں نہیں ہے کوئی سچ بھی میری ماں کی طرح

یہ جان کر کہ ہوا میری منتظر ہوگی !
میں اپنے آپ سے نکلا گُلِ خزاں کی طرح

عجب طرح کی ہے شاخوں میں تشنگی تابش
زمین چاٹ رہی ہیں مری زباں کی طرح

○

تہمت اُتار پھینکی لبادہ بدل لیا
خود کو ضرورتوں سے زیادہ بدل لیا

جی چاہتا تھا روؤں اُسے جاں سے مار کے
آنکھیں چھلک پڑیں تو ارادہ بدل لیا

جب دیکھا رہزنوں کی توجہ نہیں ادھر
شہزادگی سے خرقۂ سادہ بدل لیا

کیسے قبول کرتے مجسّم غبار کو
منزل قریب آئی تو جادہ بدل لیا

○

پسِ غبار بھی اُڑتا غبار اپنا تھا
ترے بہانے ہمیں انتظار اپنا تھا

کھڑے تھے اپنی جڑوں پر کسی شجر کی طرح
ہماری خاطرِ نازک پہ بار اپنا تھا

اسی لیے ہمیں سُورج نے ساتھ رکھا نہیں
کہ اک ستارے پہ دار و مدار اپنا تھا

○

جو کہہ چُکے تھے تو پھر ہمارا یہ حال ہونا تو چاہیئے تھا
کہ دے کے اُسکی مثال اُسکی مثال ہونا تو چاہیئے تھا

میں چاہتا تھا کہ وہ ملے اور ملے بھی مجھکو بغیر مانگے
اور اب یہ کہتا ہوں میرے لب پر سوال ہونا تو چاہیئے تھا

یہ بات سچ ہے کہ ہم تھے فانی فنا ہماری سرشت میں تھی
مگر کسی کے لیے ہمیں لازوال ہونا تو چاہیئے تھا

ہمارے ہاتھوں میں کُچھ نہیں ہے نقط لکیریں ہیں وہ بھی مُبہم
یہ ہاتھ تُو نے دیے تھے اِن میں کمال ہونا تو چاہیئے تھا

اگر میں سویا وہ کیوں نہ سویا اگر میں جاگا وہ کیوں نہ جاگا
وہ میرا تھا تو اُسے مرے حسبِ حال ہونا تو چاہیئے تھا

یہ بات اپنی جگہ کہ اُسکی مثال کوئی نہیں ہے تابش
مگر جہاں میں کسی کو اُسکی مثال ہونا تو چاہیئے تھا

○

سانس کے شور کو جھنکار نہ سمجھا جاتے،
ہم کو اندر سے گرفتار نہ سمجھا جاتے

اُسکو رستے سے ہٹانے کا یہ مطلب تو نہیں
کسی دیوار کو دیوار نہ سمجھا جاتے

میں کسی اور حوالے سے اُسے دیکھتا ہوں
مجھ کو دُنیا کا طرفدار نہ سمجھا جاتے

یہ زمیں تو ہے کسی کاغذی کشتی جیسی
بیٹھ جاتا ہوں اگر بار نہ سمجھا جاتے

اُسکو عادت ہے گھنے پیڑ میں سو جانے کی
چاند کو دیدۂ بیدار نہ سمجھا جائے

اپنی باتوں پہ وہ قائم نہیں رہتا تابشؔ
اُسکے انکار کو انکار نہ سمجھا جائے

○

مٹّی میں کوئی رنگ ملایا نہیں کرتے
یہ لوگ نئی چیز بنایا نہیں کرتے

کیا دیکھتا جاتا ہوں میں افلاک کی جانب
پنچھی تو کبھی دُھوپ میں سایہ نہیں کرتے

گِدھ بیٹھا ہے ممٹی پہ وہاں سے کریں آغاز
نیچے سے عمارت کو گرایا نہیں کرتے

اک دربدری ہم کو بھی لاحق ہے مگر ہم
کونجوں کی طرح شور مچایا نہیں کرتے

یہ لوگ بھی قامت میں صنوبر کی طرح ہیں
اُگتے ہیں جہاں سے وہاں سایہ نہیں کرتے

○

شاید کسی بلا کا تھا سایہ درخت پر
چڑیوں نے رات شور مچایا درخت پر

موسم تمہارے ساتھ کا جانے کدھر گیا
تم آتے اور بُور نہ آیا درخت پر

دیکھا نہ جائے دھوپ میں جلتا ہوا کوئی
میرا جو بس چلے کروں سایہ درخت پر

سب چھوڑے جا رہے تھے سفر کی نشانیاں
میں نے بھی ایک نقش بنایا درخت پر

اب کے بہار آئی ہے شاید غلط جگہ
جو زخم دل پہ آنا تھا آیا درخت پر

ہم دونوں اپنے اپنے گھروں میں مقیم ہیں
پڑتا نہیں درخت کا سایہ درخت پر

○

منحرف ہیں مرے ساتھی تو خدا ہی آئے
میرے حق میں بھی کبھی کوئی گواہی آئے

آڑے آتی ہے یہ حساس طبیعت ورنہ
جی تو کرتا ہے یہاں روز تباہی آئے

کوئی افواہ بھی آنگن میں اُتر سکتی ہے
یہ ضروری نہیں کھڑکی سے ہوا ہی آئے

راستہ اتنا بھی ویراں نہیں دیکھا جاتا
کوئی خوشبو، کوئی جھونکا، کوئی راہی آئے

کُھل گیا بابِ قبول اور کسی پر تابشؔ
میرے حصّے میں مرے دستِ دُعا ہی آئے

○

ایسا نہیں کہ پیاس کا صحرا نہیں ہوں میں
لیکن میانِ خیمہ و دریا نہیں ہوں میں

گر آگ ہُوں تو شعلے سے باہر نہیں گیا
گر پھُول ہوں تو شاخ سے نکلا نہیں ہوں میں

گلدان میں مری ہوئی تتلی اور ایک پھُول
سوچوں اگر تو اس سے زیادہ نہیں ہوں میں

یہ لوگ ڈھونڈتے ہیں کسی سے مطابقت
میرا یہ مسئلہ ہے کہ خود سا نہیں ہوں میں

○

وہ آنے والا نہیں پھر بھی آنا چاہتا ہے
مگر وہ کوئی مناسب بہانا چاہتا ہے

یہ زندگی ہے، یہ تُو ہے، یہ روزگار کے دُکھ
ابھی بتا دے کہاں آزمانا چاہتا ہے

کہ جیسے اُس سے ملاقات پھر نہیں ہو گی
وہ ساری باتیں اکٹھی بتانا چاہتا ہے

میں سُن رہا ہوں اندھیرے میں آہٹیں کیسی
یہ کون آیا ہے اور کون جانا چاہتا ہے

نکلا ہُوا ہوں اپنے تعاقب میں دیر سے
حالانکہ اپنا نقشِ کفِ پا نہیں ہوں میں

دستک ہر ایک در پہ میں دیتا ہُوں دیر تک
لیکن کسی مکاں سے نکلتا نہیں ہوں میں

پچھلے کئی دِنوں سے عجب بے خیالی ہے
یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ ہُوں یا نہیں ہوں میں

اب آئینے سے ربط نہ مینا سے گفتگو
تابشؔ کسی کے بعد کسی کا نہیں ہوں میں

اُسے خبر ہے کہ مجنوں کو راس ہے جنگل
وہ میرے گھر میں بھی پودے لگانا چاہتا ہے

وہ خود غرض ہے محبت کے باب میں تابش
کہ ایک پل کے عوض اِک زمانہ چاہتا ہے

○

جنہیں دُشمن سمجھتے تھے وہی اپنے نکل آئے
مگر اُس وقت جب ہم مارنے مرنے نکل آئے

یہاں تک آ کے لگتا تھا کہ آگے کچھ نہیں ہوگا
پلٹ جانے کا سوچا تو کئی رستے نکل آئے

ہمارے پاؤں اُلٹے تھے فقط چلنے سے کیا ہوتا
بہت آگے گئے لیکن بہت پیچھے نکل آئے

اچانک نیند کھلنے سے ہمیں دُکھ تو بہت پہنچا
مگر ہم اس طرح کنجِ اذیت سے نکل آئے

بُھلانا، یاد کرنا اور پھر تُم کو بھلا دینا
تمہارے بعد بھی کُچھ سلسلے اچھے نکل آئے

بھٹکنے سے بچایا حُسنِ کم اطراف نے ہم کو
کہ صد راہے تک آئے اور پھر سیدھے نکل آئے

مسائل کو گرہ دیں تو لہو رستا ہے پوروں سے
ہمارے چاکِ دامن سے یہ کیا دھاگے نکل آئے

کسی نے کاٹ ڈالا اُن کو بے مصرف شجر کہہ کر
جب اپنے احتجاجی ہاتھ مٹی سے نکل آئے

مری کوتاہ دستی کا بھرم دیوار نے رکھا
میں دستک دینے والا تھا کہ دروازے نکل آئے

بکھر جانے کے ڈر سے پھول کھلتے ہی نہ تھے تابش
پھر اک دِن تیز آندھی میں درختوں سے نکل آئے

یہ شہر روز ہی بستا ہے روز اُجڑتا ہے
مگر غنیم کو کیا اِس سے فرق پڑتا ہے

خدا نے ہم میں یہ کیا قدرِ مشترک رکھی
کہ میری آنکھ ترے لب سے پھول جھڑتا ہے

ہمارے ساتھ محبت کا جو سلوک بھی ہو
سوال یہ ہے کہ دُنیا کا کیا بگڑتا ہے

شکستگی میں بھی معیار اپنے ہوتے ہیں
گرے مکان تو اپنے ہی پاؤں پڑتا ہے

یہی پسند نہیں ہے مجھے محبت میں
یہ روز روز جو دُنیا سے کام پڑتا ہے

کچھ ایسی جم گئی سنجیدگی مرے رُخ پر
کسی طرح سے یہ پتھر نہیں اُکھڑتا ہے

ابھی جلے تھے ابھی بُجھ بجھا گئے تابشؔ
ہواؤں سے تو کوئی دم دیا بھی لڑتا ہے

○

عجب سا ذائقہ ہُوں میں
زمیں کی اشتہا ہُوں میں

شجر کٹنے نہیں دُوں گا
پرندوں کی دُعا ہُوں میں

سمجھنا ہے اُسے لیکن
کتابیں پڑھ رہا ہُوں میں

ابھی چڑیاں نہ بولیں گی
بہت جاگا ہُوا ہُوں میں

مری تسکین کیسے ہو
تری جھوٹی اَنا ہُوں میں

اکٹھے کر کے ٹوٹے پر
زمیں سے باندھا ہُوں میں

مکمل بھی اُدھورا بھی
انوکھا تجربہ ہُوں میں

ابھی کُچھ لوگ باقی ہیں
ابھی کیوں مر رہا ہُوں میں

کسی کے مُنہ نہ لگ جاؤں
لہو کا ذائقہ ہُوں میں

سفر اچھا نہیں لگتا
کہاں سے آ رہا ہوں میں

بہت مجبور ہوں تابش
مگر اپنا خدا ہوں میں

○

چاند چمکا جنگلوں پر آسماں کا در کھُلا
یہ عجب قیدی شبِ تاریک کے اندر کھُلا

آتشِ نوروز سے کچھ فاصلے پر پھُول تھے
لوگ منظر پر گئے اور مجھ پہ پس منظر کھُلا

میں ہی کیا اُسکو بھی اب زعمِ شناسائی نہیں
وہ نہیں مجھ پر کھُلا تو میں بھی کب اُس پر کھُلا

اے تکلف کیش دُنیا میری مجبوری سمجھ
میں تو اپنے آپ سے بھی تیرے کہنے پر کھُلا

دِل کو ناکارہ سمجھ کر رکھ دیا تھا شام سے
جب ہوئی کمرے میں تاریکی تو یہ پتھر کھُلا

یہ غنیمت ہے کہ اُس سے گفتگو کرتا ہوں میں
تابشؔ اُس بُت کے مقابل کوئی تو خود سر کھُلا

○

اِک ٹہنی پر پھُوٹے پھلے ہیں پاکِستان اور میں
ہر موسم میں ساتھ رہے ہیں پاکِستان اور میں

کالی رات ، ہوا طوفانی ، مولا پار اُتار
ایک ہی کشتی میں بیٹھے ہیں پاکستان اور میں

غافل بھی نہیں رہنے دیتی خوف سمے کی رات
باری باری سو لیتے ہیں پاکستان اور میں

اُس کے سر پر باپ کی پگڑی میں ہوں نافرمان
ایک ہی شخص کے دو بیٹے ہیں پاکستان اور میں

اور ابھی کچھ وقت لگے گا تھکن اُتارنے میں
ہجرت کر کے آتے ہوئے ہیں پاکستان اور میں

اپنی مثال تو یوں ہے تابشؔ جیسے دو مجذوب
اپنے آپ میں گم رہتے ہیں پاکستان اور میں

○

بے صدا ٹھہرے ہونٹ کھول کے ہم
آ چکے تنگ بول بول کے ہم

سر پہ ماں کی دُعا کا سایہ نہیں
گھر سے نکلے ہیں جھوٹ بول کے ہم

اپنے اندر بھی اِک تماشا ہے
کیا کریں کھڑکیوں کو کھول کے ہم

نام اُس کا لیا نہیں جاتا
بات کرتے ہیں ناپ تول کے ہم

وہ ملے گا مگر ملے گا کیسے
اُسے ڈھونڈیں گے خُود کو رول کے ہم

شاید اپنی صدا سُنائی دے
دیکھ لیتے ہیں اونچا بول کے ہم

جو ملا اُس پہ مر مِٹے تابش
کتنے اچھے تھے میل جول کے ہم

○

کون کس کا ہے ہمسفر اے دوست
ایسا ممکن نہیں مگر اے دوست

فرصتِ یک نگاہ بھی تو نہیں
بات کر اور مختصر اے دوست

تُو نے چھوڑا جہاں وہیں ہیں ہم
طے نہیں ہو رہا سفر اے دوست

زندگی تو یہاں گزرنا تھی
لے چلا تو ہمیں کدھر اے دوست

اب کسی اور سمت چلتے ہیں
تھک گئی ہے یہ رہگذر اے دوست

اس طرح تو نہ وقت گذرے گا
کوئی اچھی بُری خبر اے دوست

کوئی رستہ ضرور نکلے گا
گھومتے ہیں اِدھر اُدھر اے دوست

اس لیے گھر سے میں نکلتا نہیں
ساتھ جاتے ہیں بام و در اے دوست

○

اُس کی خواہش کروں تو یہ دھڑکا ملے
جانے کب وہ ملے اور کیسا ملے

اتفاقات کو میں نہیں مانتا
کوئی بچھڑے، بچھڑ کر دوبارہ ملے

کیسے ممکن ہے تسخیرِ دُنیا نہ ہو
ایک تجھ سا ملے ایک مُجھ سا ملے

تو کسی حال میں مَیں کسی حال میں
کیسے ہم کو یہاں ایک فردا ملے

بد دُعا ہے تو پھر بد دعا ہی سہی
تیرے کچّے گھڑے کو نہ دریا ملے

رتجگے تو ہیں کانٹوں بھری ٹہنیاں
کوئی سپنا ملے اور سہانا ملے

جس کو سوتا ہوا چھوڑ آئے تھے ہم
کِس کو معلوم وہ کِس گھڑی آ مِلے

کوئی ملتا نہیں اور تجسّس وہی
کوئی ایسا ملے ، کوئی ایسا ملے

اس کڑی شرط نے مجھ کو تنہا رکھا
کوئی دشمن ملے اور مجھ سا مِلے

تابشؔ اپنی کہانی کا لُبِ لُباب
ایک چہرہ ملے اور پیارا ملے

○

کون کہتا ہے محبت مر گئی
اُسکی آنکھوں میں چمک موجود ہے

میری آنکھوں میں ہی پانی بھر گیا
وہ تو اب بھی دُور تک موجود ہے

وہ بھی شاید رات رویا ہے بہت
سبز آنکھوں میں دھنک موجود ہے

وہ کسی کا بھی نہیں تابشؔ مگر
اس یقیں کے ساتھ شک موجود ہے

○

سکوتِ دہر رگوں تک اُتر گیا ہوتا
اگر میں شعر نہ کہتا تو مر گیا ہوتا

یہ عُمر تُم نے مُجھے دی تھی اَنا کر کے
بَلا یہ تن سے نہ جاتی تو مر گیا ہوتا

سمیٹ رکھا ہے اپنے ہی خوف نے مُجھ کو
اگر میں خاک نہ ہوتا بکھر گیا ہوتا

مجھے کلام پہ مجبور اگر نہ کرتا دل
مرا سکوت کوئی کام کر گیا ہوتا

تیاگ دیتے اگر ہم مکالمہ اُس سے
ہوائے تیز ترا شور و شر گیا ہوتا

یہاں جو اُونچی فصیلوں سے پیڑ جھانکتے ہیں
اگر میں ان کی جگہ ہوتا ڈر گیا ہوتا

تم اپنی سالگرہ پر ہی کھولتے پنجرے
اُجاڑ دن تو پرندوں سے بھر گیا ہوتا

وہ ایک نام ہی تھا اشک تو نہ تھا تابش
میں کوئی روز اُسے ضبط کر گیا ہوتا

○

وہ کون ہے جو پسِ چشمِ تر نہیں آتا
سمجھ تو آتا ہے لیکن نظر نہیں آتا

اگر یہ تم ہو تو ثابت کرو کہ یہ تم ہو
گیا ہوا تو کوئی لوٹ کر نہیں آتا

یہ دل بھی کیسا شجر ہے کہ جسکی شاخوں پر
پرندے آتے ہیں لیکن ثمر نہیں آتا

یہ جمع خرچ زبانی ہے اُسکے بارے میں
کوئی بھی شخص اُسے دیکھ کر نہیں آتا

ہماری خاک پہ اندھی ہوا کا پہرہ ہے
اُسے خبر ہے یہاں کُوزہ گر نہیں آتا

یہ بات سچ ہے کہ اُسکو بُھلا دیا میں نے
مگر یقیں مجھے اس بات پر نہیں آتا

نظر جمائے رکھوں گا میں چاند پر تابش
کہ جب تلک یہ پرندہ اُتر نہیں آتا

○

کُھلا مہتاب بھی ٹوٹے ہُوئے در کے حوالے سے
سمجھتا ہُوں میں اشیاء کو فقط گھر کے حوالے سے

مرے مایُوس ہونے سے ذرا پہلے ہی لوٹ آنا
کہ میں بھی سوچتا ہوں اب مقدر کے حوالے سے

اگر سوچا کبھی میں نے تری قامت نگاری کا
حوالہ مختلف دُوں گا صنوبر کے حوالے سے

کہ تجھ پر ختم تھا رُوئے سخن اپنی طرف کرنا
بتا کیا گفتگو کرتے گُلِ تر کے حوالے سے

کئی چہرے بدل کر میں پہنچ پایا ہُوں تیرے تک
مجھے پہچان میرے دیدۂ تر کے حوالے سے

دلِ برباد اتنا بھی گیا گُذرا نہیں تابشؔ
یہ بستی جانی جاتی ہے اِسی گھر کے حوالے سے

○

دشتِ جنون و کوہِ ارادہ اُٹھا لیا
سنبھلے گا کیسے بوجھ تو اِتنا اُٹھا لیا

اُس لب کے سارے پھُول تو شاخوں نے لے لئے
اور میں نے اِک گرا ہُوا وعدہ اُٹھا لیا

کیا کُچھ نہیں تھا مالِ غنیمت کے طور پر
میں نے بس ایک طوقِ تمنّا اُٹھا لیا

شاید میں دل کو ضبط سے لبریز کر سکوں
خالی تھا اِس لیے یہ پیالہ اُٹھا لیا

انگارہ سی زمیں پہ پڑے ہی تھے دل کے پاؤں
تابش کسی نے بڑھ کے یہ بچّہ اُٹھا لیا

○

اِسی لیے مرا سایہ مُجھے گوارا نہیں
یہ میرا دوست ہے لیکن مرا سہارا نہیں

یہ مہر و ماہ بھی آخر کو ڈوب جاتے ہیں
ہمارے ساتھ کسی کا یہاں گزارا نہیں

ہر ایک لفظ نہیں تیرے نام میں شامل
ہر ایک لفظ محبّت کا استعارہ نہیں

تمھی سے چلتے ہیں سب سلسلے تعلق کے
وہ اپنا کیسے بنے گا کہ جو تمھارا نہیں

اور اب برہنگی اپنی چھپاتا پھرتا ہوں
مرا خیال تھا میں خود پہ آشکارا نہیں

ابھی میں نشۂ لا حاصلی میں رہتا ہوں
ابھی یہ تلخیٔ دنیا مجھے گوارا نہیں

لیے تو پھرتا ہوں آنکھوں میں نا تمام سا نقش
اُسے مٹاؤں گا کیسے جسے اُبھارا نہیں

زمیں کا حُسن مکمل نہ ہو سکا تابشؔ
کہیں چراغ نہیں ہے کہیں ستارہ نہیں

○

کون کہتا ہے کہ وہ بھولتا جاتا ہے مُجھے
اپنا چہرہ نہ سہی رہ تو دکھاتا ہے مُجھے

صبح کے ساتھ میں کھو جاتا ہوں بچّے کی طرح
شام ہوتے ہی کوئی ڈھونڈ کے لاتا ہے مجھے

آپ کچھ اور بتاتے ہیں مرے بارے میں
آئنہ اور کوئی شکل دکھاتا ہے مُجھے

آج اِک عُمر میں یہ بھید کھُلا ہے مُجھ پر
وہ کوئی اور نہیں ہے جو ڈراتا ہے مُجھے

سرد مہری میں یہ سورج بھی ہے تیرے جیسا
دُور ہی دُور سے جو دیکھا جاتا ہے مجھے

یہ نہ میں ہُوں نہ ہوا ہے نہ قضا ہے تابش
میرے لہجے میں کوئی اور بلاتا ہے مجھے

○

ہنسنے نہیں دیتا کبھی رونے نہیں دیتا
یہ دِل تو کوئی کام بھی ہونے نہیں دیتا

تم مانگ رہے ہو مرے دِل سے مری خواہش
بچّہ تو کبھی اپنے کھلونے نہیں دیتا

میں آپ اُٹھاتا ہوں شب و روز کی ذلت
یہ بوجھ کسی اور کو ڈھونے نہیں دیتا

یہ کون ہے اُس سے تو میں واقف بھی نہیں
جو مُجھ کو کسی اور کا ہونے نہیں دیتا

○

وہ بھولتا ہے نہ دِل میں اُتارتا ہے مجھے
ہمیشہ مار محبّت کی مارتا ہے مجھے

میں اُس کا لمحۂ موجود ہوں مگر وہ شخص
فضول وقت سمجھ کر گذارتا ہے مجھے

بظاہر ایسا نہیں پیڑ اُس حویلی کا
ہوا چلے تو بہت پھول مارتا ہے مجھے

میں اُس کے ہاتھ سے جاتا ہوں مال وزرکیطرح
وہ روز قرض سمجھ کر اُتارتا ہے مجھے

○

اس جہاں میں عجب نہیں کچھ بھی
پہلے کیا کچھ تھا اب نہیں کچھ بھی

پھول کھلتا ہے شاخ سے باہر
خندۂ زیرِ لب نہیں کچھ بھی

مختصر یہ کہ اچھے لگتے ہو
چاہنے کا سبب نہیں کچھ بھی

نامرادی کے دشت میں تابش
ڈھونڈتا کیا ہوں جب نہیں کچھ بھی

○

شام ہوتی ہے تو یاد اُس کو بھی گھر آتا ہے
اک پرندہ مرے کاندھے پہ اُتر آتا ہے

چُھپتا پھرتا ہوں کہ وہ دیکھ نہ لے زخمِ طلب
جسم کے پار اُسے صاف نظر آتا ہے

○

دُھندلی سمتوں میں اگر کُونج کا پر مِل جائے
پھر تو اے در بدری مجھ کو بھی گھر مِل جائے

اور ہی رنگ میں ہو برگ و ثمر کا ہونا
جس کی خواہش ہے مجھے وہ بھی اگر مِل جائے

منتظر جس کا ہوں وہ آئے ضروری تو نہیں
یہ بھی ممکن ہے کوئی اور خبر مِل جائے

اہتمام ایسا ہو فرصت کے دنوں میں دل کا
ایک ڈر ختم ہو اور دوسرا ڈر مل جائے

اس طرح سے نہ گذاروں گا یقیناً تجھ کو
زندگی تو جو مجھے بارِ دگر مل جائے

بوئے موجود سے موہوم اشارے تک ہے
میری حیرت کسی ڈوبے ہوئے تارے تک ہے

ہم نے اک عمر ترے دھیان میں رہ کر دیکھا
یہ سمندر بھی کسی اور کنارے تک ہے

تجھ مہک کو نہ ملا کوئی ہواؤں جیسا
ایک ہم ہیں سو تری بات ہمارے تک ہے

میری نظروں میں ہے خس خانۂ عالم جو بھی
سب تری نیم نگاہی کے اشارے تک ہے

پہلے ہم ناز اُٹھاتے تھے بہت اس دِل کے
لیکن اب اس کی کفالت بھی گذارے تک ہے

○

شام کا بھولا ہوا وقتِ سحر آجائے گا
وہ بھی سورج کی طرح کل لوٹ کر آجائے گا

اس قدر شفاف کر دے گی یہ تنہائی مجھے
دیکھنے والوں کو تو مجھ میں نظر آجائے گا

اس لیے ڈھلنے نہیں دیتا تری قربت کا دن
زندگی میں وقفۂ شام و سحر آجائے گا

پا شکستوں کا بھرم رکھیں گی کب تک کشتیاں
پانیوں کے بعد خشکی کا سفر آ جائے گا

زندہ رہنا ہے کسی کے بعد سو تابشؔ مجھے
اک نہ اک دن زندہ رہنے کا ہنر آ جائے گا

○

یہ ہجر کا موسم بھی گزر کیوں نہیں جاتا
"جاتا ہوا لگتا ہے مگر کیوں نہیں جاتا"

بہتا ہوں تو میری کوئی گہرائی بھی ہوگی
دریا کی طرح خود میں اتر کیوں نہیں جاتا

لازم ہے کہ جاگے کبھی بچے کی طرح بھی
یہ شہر کسی خواب سے ڈر کیوں نہیں جاتا

ملبے سے نکل آتا ہے آسیب کے مانند
لوگوں کی طرح خوف بھی مر کیوں نہیں جاتا

اس کُنج میں مُدّت سے بہار آئی نہیں ہے
یہ باغ مری آنکھ میں بھر کیوں نہیں جاتا

یہ بھید بھی کُھلنے نہ دیا در بدری نے
گھر کے لیے جاتا ہوں تو گھر کیوں نہیں جاتا

ملبُوس سے کیوں منّتِ یکجائی ہے نالش
میں ٹوٹ چکا ہوں تو بکھر کیوں نہیں جاتا

○

طلُوعِ ہجر کی بستی میں چاند سا نکلے
کبھی تو گھر سے مرا یارِ کم نُما نکلے

میں کیا کہوں کہ مُجھے بولنے کی عادت ہے
خُدا کرے نہ مرے دل سے مُدعا نکلے

یہ دل کہ ڈوبنے لگتا ہے دیکھ کر اُس کو
یہ ناؤ ساحلِ رسوائی پر نہ جا نکلے

بلند ہو کے بھی پہنچے نہ آسمانوں تک
یہاں کے سارے شجر دستِ بے دُعا نکلے

○

ہاتھ تو اُس نے بڑھایا مری جانب اپنا
کیا خبر شاخ ہی ساتھ اپنا شجر لے آئے

ڈھلتا سورج تو نہ ہاتھ آیا کہ لاتے اُس کو
ایک رستہ تھا جسے شام کو گھر لے آئے

وہ غزالوں کی طرح گھر سے تو نکلا تا لبِ شب
عین ممکن ہے اُسے خوف اِدھر لے آئے

○

جمالِ یار کی مشعل اُٹھا کے دیکھتے ہیں
نہ جانے کون کہاں پر ہے، جا کے دیکھتے ہیں

کسی کی راہ میں پتّے بچھا رہا ہے کوئی
شجر کی اوٹ سے جھونکے ہوا کے دیکھتے ہیں

سِسک رہی ہے اگر بات لفظ کے نیچے
تو ایسا کرتے ہیں پتھر ہٹا کے دیکھتے ہیں

جو کھو گیا تھا بہر حال ڈھونڈنا ہے اُسے
نہیں چراغ تو خیمہ جلا کے دیکھتے ہیں

انا رہے گی ہماری مگر بھرم اُس کا
اُسی کے لہجے میں اُس کو بلا کے دیکھتے ہیں

○

کبھی نیندیں کبھی آنکھوں میں پانی بھیج دیتا ہے
وہ خُود آتا نہیں اپنی نشانی بھیج دیتا ہے

بناتا ہے وہ کاغذ پر شجر اور بعد ازاں اُن کو
مری جانب برائے باغبانی بھیج دیتا ہے

کسی کو سر اُٹھانے کی بھی فرصت کیوں میسّر ہو
وہ ہر سر کے مطابق سرگرانی بھیج دیتا ہے

میں جب متروک ہوتا ہوں پُرانے لفظ کی صُورت
مجھے تابش کوئی تازہ مُعانی بھیج دیتا ہے

○

گذشتہ اُمّتوں کی انتہا سے ڈر نہیں لگتا
"یہ کیسے لوگ ہیں جن کو خدا سے ڈر نہیں لگتا"

دباؤ جھیلنے والے دباؤ میں نہیں آتے
شکستہ بادنوں کو ہوا سے ڈر نہیں لگتا

○

شام سفر کی حد پہ تھے دن رات کی طرح
ہم بھی کبھی ملے تھے تضادات کی طرح

تُو نے تو اپنے ساتھ مجھے بھی بدل دیا
میں تو نہیں تھا تیرے خیالات کی طرح

یہ پیڑ بھی عجیب ہیں ہنستے نہیں کبھی
پھولوں کو ضبط کرتے ہیں جذبات کی طرح

سُورج کے سائباں میں کوئی چھید پڑ گیا
اب روشنی بھی ہوتی ہے برسات کی طرح

شہروں سے تنگ اور ہم آہنگ بھی بہت
بالکل یہ کُنجِ دل ہے مضافات کی طرح

یہ بھی جمالِ یار کا احسان کم نہیں
ہم پر اثر کیا نہیں حالات کی طرح

یُوں ہی سا ایک چہرہ کہ دیکھا تھا سرسری
اب کُھل رہا ہے مجھ پہ کرامات کی طرح

بازار جا کے بھی نہ بُھلا پایا میں اُسے
یاد آیا وہ مجھے مری اوقات کی طرح

○

سنہرے خواب بُننے، خاک سے نباہ کیا
یہ کام سیر کا ہم نے مثالِ ماہ کیا

وہی گھڑی تھی سفر میں قیام کرنے کی
ترے خیال نے جب ہم کو گردِ راہ کیا

اسی زمین پہ ٹوٹے ہیں آسمان بہت
اسی زمین نے افلاک سے نباہ کیا

اور اب نگاہ میں جس کو چھپائے پھرتا ہوں
اُسی چراغ نے ہر آئینہ سیاہ کیا

اسی لیے ہے کھنڈر پر گمانِ بام و در
جو گھر بنا ہی نہیں تھا اُسے تباہ کیا

اگرچہ زندہ رہے عشق کے تسلسل میں
مگر یہ کام طبیعت نے گاہ گاہ کیا

○

چمکے گا شجر پر نہ مرے گھر میں رہے گا
وہ چاند ہے اور چاند سمندر میں رہے گا

اب سانپ کے مانند مرے پیچھے پڑا ہے
شب کو یہی سایہ مرے پیکر میں رہے گا

خواہش کو خدا رزق بہم کرتا ہے دل میں
لگتا ہے یہ کیڑا اسی پتھر میں رہے گا

آتے ہیں تو سستا کے چلے جائیں گے پنچھی
وہ پیڑ اُسی طرح اُسی گھر میں رہے گا

ستارے بھی تو محور سے نکل جاتے ہیں پیارے
آخر کوئی کب تک ترے چکّر میں رہے گا

یہ عشق بھی رہتا نہیں لگتا مجھے تابشؔ
سر چڑھ کے جو بولے وہ کہاں سر میں رہیگا

واپسی

یہ بارہ سال پہلے کی کہانی ہے
کہ جب سرسوں کی گندل تھا بدن میرا
ہوا مُجھ کو کھِلاتی تھی
مُجھے چرخے کی گُھوکر ہی سے گہری نیند آتی تھی
دہن میں شیرِ مادر کی مہک کے آخری دن تھے
جوانی جھلملاتی تھی

یہ بارہ سال پہلے کی کہانی ہے

یہ بارہ سال پہلے کی کہانی ہے ۔
میں اپنے آپ میں رہتا تھا جیسے پھول میں خوشبو
مجھے اک نام جو گڑ کی طرح میٹھا تھا اب بھی ہے
اُسی کی شکریں چھب میں
کہانی تو بڑھاتی تھی

یہ بارہ سال پہلے کی کہانی ہے
میں ہاتھوں سے گرا حرفِ دُعا بن کر
مگر بوسوں بھری شفقت تسلی ڈھونڈ لاتی تھی
نہ میں سرسوں کی گندل تھا
نہ مجھ کو نیند آتی تھی
عجب سی بے ثباتی تھی
پھر اک دن بے گھری مجھ کو مرے گھر سے نکال آئی
کہ جیسے آنکھ سے آنسو نکل کر پھر نہیں آتا

تجھے تو سب خبر ہو گی
مجھے مُلکِ جنوں میراث میں دے کر کوئی واپس پلٹ آیا
وہاں کی جاگتی راتیں
سرِ خامہ اُترتی نیند کی گھاتیں
وہ دفتر میں پڑے پتھر کے لب سے پھُوٹتی باتیں
نہ میں سرسوں کی گندل تھا
نہ اب چرخے کی گھُوکر تھی کہ مجھ کو نیند آ جاتی
پری مجھ کو ڈرا جاتی

یہ بارہ روز پہلے کی کہانی ہے
مجھے گاڑی نے اسٹیشن پہ لا پھینکا
تو میرا شہر ہی گم تھا
مری پہچان ہی گم تھی
مرے دُکھ سے بھرا تانگہ گیا جب ریلوے بازار کی جانب

مرا گھر بھی مرے بچپن کی صورت
گردِ گزراں میں کہیں گم تھا
پھر اک شہتوت کی چھاؤں سے پوچھا اپنے بارے میں
پھر اک بے عمر پنواڑی کا شکنوں سے بھرا چہرہ
کسی سیّاح کے نقشے کی صورت کھل گیا مجھ پہ

نہ اُس میں میرا بچپن تھا
نہ میرے خانہ زادوں کی نشانی تھی
پھر اک دکان پر لٹکی ہوئی تصویر سے پوچھا
تجھے تو سب خبر ہوگی
یہاں عباس تابش نام کا اک شخص رہتا تھا
کہاں ہے وہ
نہ اب سرسوں کی گندل ہے
نہ وہ چرخے کی گھوکر ہے

مگر اک بند دروازے پہ دھندلے نام کی تختی
مرے گھر کی نشانی ہے۔
یہ میری آج کے دن کی کہانی ہے۔

جی سی میں نینا کے ساتھ پہلا دن

پہلا دن ہے

کالج کی آباد سرا میں یہ پہلا دن ہے

اوول میں پھولوں کی پلٹن دھوپ کی کلیاں چنتی ہے

اور سرخ پرندہ ٹاور کی چوٹی سے گیت گراتا ہے

تو بھی خوشی کے پاگل پن سے باہر آ...... او پاگل تتلی

دیکھ چمکتے پھولوں کی لب بوسی پر

وہ پاس ہی رکھے بینچ پہ بیٹھی نینا پر

اور اسکے پاس کھڑے اک آدم زاد کی بجھی بجھی پیشانی پر

یہ پہلا دن ہے

آؤ نینا

پہلے دن کی ہری بھری ویرانی میں

کچھ پھول کھلائیں جاگنے والی آنکھوں جیسے

آؤ نینا

بوڑھی ماں کے دل جیسے کمروں میں بیٹھیں

کمرے....... جن میں عمریں ٹھہر گئی ہیں

عمریں...... جن کے جسموں میں صندل کی

خوشبو رچی ہوتی ہے

خوشبو........ جس سے وصل کے لمحے جڑے ہوتے ہیں

لمحے........ جن کے سمتاوے کا پہلا دن ہے

آؤ نینا

پہلے دن کے باغیچے میں تتلی پکڑیں

خوشبو ڈھونڈیں

پہلے دن کے لہجے میں ہم

پیڑوں کو آوازیں دیں
اس دن کی کڑی اُداسی ہنستے دُکھ کی بھینٹ چڑھائیں
کالج کی کنٹین پہ جائیں
چائے کی پیالی میں بچپن کا چہرہ دیکھیں
یاد کریں وہ دِن جب ہم بھی پھولوں جیسی چھب رکھتے تھے
آؤ نینا
اس سے پہلے
ٹاور پر بیٹھا یہ سُرخ پرندہ اُڑ جائے
ہم آج کے دن کا اک اک لمحہ
تین سو پینسٹھ دنوں کے خالی کشکولوں میں بھر دیں
آؤ نینا
ٹاور کے گھڑیال کی سُوئی
سُرخ پرندے کی منقار ہوئی جاتی ہے

اس سے قبل کہ لمحے چوگا بن جائیں
ہم کالج کی آباد سرا میں
پہلے دن کی خوشی سے پاگل ہو جائیں

پرندوں اور درختوں کا ہمزاد

(عدنان بیگ کے لیے)

پرندوں کی زباں تم جانتے ہو
درختوں سے تمہاری دوستی ہے
محبّت نے تمہیں عورت کے دل سے لے کے دنیا تک
برش سے اُلجھنوں میں رنگ بھرنے
مُوقلم سے زخم لکھنے اور یاروں میں اُداسی کو نیا مفہوم دے کر
نظم کہنے کا سلیقہ دے دیا ہے
تمہارے لفظ سچّے ہیں

کسی عورت کی آنکھوں میں جھلکتی خواہشوں جیسے
زمینوں سے زمانوں تک
کسی تصویر میں ٹھہرے خیالوں سے پرندوں کی اُڑانوں تک
تمہارے لفظ سچّے ہیں
تمہارے رنگ گہرے ہیں
مرے دِل کی طرح ان سے کئی معنی نکلتے ہیں
درخت ان کو سمجھتے ہیں
تمہارے رنگ گہرے ہیں
مگر سب پر تمہارا رنگ غالب ہے
پکاسو کی طرح تم اپنی تصویروں سے آگے ہو
مگر یہ دُکھ کہاں تم جانتے ہو
یہاں کی سرد بازاری سے باہر
تم کسی عورت کے دل سے شہریت لے کر
مجھے نظمیں سُناتے ہیں

کہ میں بھی اک شجر ہوں، اک پرندہ ہوں

درختوں سے تمہاری دوستی ہے

پرندوں کی زباں تم جانتے ہو

اُداسی کی بے معنویت پر ایک نظم

اُداسی تیرا دِل ہوتی

تو پھر میں اُس میں گھر کرتا

کوئی دن یُوں بسر کرتا

....

اُداسی تیرے لب ہوتی

تو بڑھ کر چوم لیتا میں

اور اُن کو اپنی تلخی کی خبر کرتا

کوئی دِن یُوں بسر کرتا

اُداسی آسماں ہوتی
تو میں تیری طرح اُس پر نظر کرتا
کوئی دن یُوں بسر کرتا

....

اُداسی ریت ہوتی تو
میں سُورج کی طرح اُس پر سفر کرتا
کوئی دِن یُوں بسر کرتا

....

اُداسی شامِ غم ہوتی
تو میں بھی تیرے ہونٹوں سے ادا ہو کر
درختوں میں سفر کرتا
یہی کچھ عُمر بھر کرتا

....

برگد سے دُشمنی کا موسم

تو یُوں ہے کہانی مری
میں اکیلا رہا دِل کے ہوتے ہوتے
میرا دل جیسے برگد کے نیچے کسی سلطنت کا
تہی تخت شہزادۂ بے یقیں ہو
نہ سر پر فلک
اور نہ پاؤں کے نیچے کھسکتی زمیں ہو
اور اس پہ ستم یہ زمانہ لہو سے بھری آستیں ہو
تو ایسے میں برگد سے پیوند ہوتی ہوئی ہڈیوں کی طرح

میں نے سوچا بہت ....

سال دس مُجھ پہ مٹی کی صورت گرے

اور اب گُلبدن یہ کہانی مجھے

حرف و معنی میں دیوار سی لگ رہی ہے

مگر یہ ابھی طے نہیں ہے

کہ تم حرف ہو اور معنی مرا خواب ہے

کہاں ہو .... مرے گُلبدن تم کہاں ہو

تمہاری محبت میں برگد کو چھوڑ آیا ہوں

تم کہاں ہو .... مرے پاس آؤ

کہ میں نے زرہ خواب کی پہن لی

ایک لمحے کے اندر کئی مورچہ بند لمحوں سے

میری تھکن لڑ رہی ہے

مرے پاس آؤ

کہ ہم اپنے دُشمن کو تنہائی کے خوف سے مار دیں

میں نے تنہائی کا تجربہ کر لیا ہے

میں تنہا رہا ہوں

زمانے کے برگد کے نیچے

مگر گُلبدن تم نہیں جانتے

جو اکیلا رہا وہ خدا بن گیا

اور میں تو فقط "لا" کے قدموں تلے پس رہا ہوں

مجھے یاد ہے ایک میں تھا

مرے دل میں عورت بھی تھی

اور بوئے گنہ بھی مری پوٹلی میں بندھی تھی

مرا حرفِ کُن

ایک بے دھار خنجر کے مانند میری ہی گردن پہ تھا

ایسی تنہائی تھی

آدمی بھی نہ تھا میں خدا بھی نہ تھا

اور پھر ایک دن

میری خواہش نے تتلی بنا کر اُڑایا مجھے

کیوں اُڑایا مجھے ...... یہ ابھی گُلبدن تُم نہیں جانتے

تُم نہیں جانتے

کیوں مرا خون قالین کی طرح مٹّی پہ ڈالا گیا

کیوں سیاہی سے میرے بدن پر مرے جُرم لکھے گئے

کیوں کسی مورچہ بند لمحے کے پیکر سے لمحے نکلتے رہے

تم نہیں جانتے

کیوں مرے خواب اونٹوں کے ہونٹوں کی صُورت

لٹکتے رہے اور گرے تک نہیں

اس میں کُچھ شک نہیں ...... تم نہیں جانتے

تم میرے پاس آؤ

کہ میں اب خدا بھی نہیں آدمی بھی نہیں

میں تمہاری محبت میں برگد کو چھوڑ آیا ہوں

میں نے تنہائی کا تجربہ کر لیا ہے

مرے پاس آؤ

کہ ہم اپنے دُشمن کو تنہائی کے خوف سے مار دیں

محبّت فقط لفظ ہے

کیا تجھے یاد ہے
تو نے مجھ سے کہا تھا
محبّت فقط لفظ ہے اس کے معنی نہیں

کیا تجھے یاد ہے
میں کہ تیرے لیے کچھ نہ تھا
اب بھی تیرے لیے کچھ نہیں ہوں
مگر ایک بوسیدہ اجرک (جسے ہم زمیں جانتے ہیں) پہ
کھلتی ہوئی شام سی

چاندنی روتے مہتاب کی چاندنی اور بس!

ہاں مجھے یاد ہے
تو نے جس شخص کے خواب دیکھے، سنائے مجھے
میں کہ تیرے لیے "راجہ گدھ" بھی نہ تھا
پھر بھی اچھے لگے
تیرے دیکھے ہوئے خواب اچھے لگے
"اُس" کی باتیں ترے ساتھ کرتے رہے
دن گذرتے رہے
"اُس" کی باتیں ترے بعد بھی خود سے کیں
لیکن اس بات کو مدّتیں ہو گئیں

یہ تری کوکھ اور آنکھ خالی ہے کیوں؟
تُو نے سوچا کبھی؟

تُو نے مجھ سے کہا تھا

محبّت فقط لفظ ہے اس کے معنی نہیں

سو محبّت کا نشّہ تری شاخِ جاں پر نہیں کھل سکا

اور محبت کا معنی تھا "بیٹا"

جو تجھ کو کہیں سے نہیں مل سکا۔

کھوئی ہوئی نظم کی یاد میں

کبھی بچپن میں

بھیگی ریت سے میں نے

بنایا تھا گھروندا اور پہلی نظم لکھی تھی

سُنانا چاہتا تھا میں تمہیں شاید ....

مگر شاید ....

اب آئے ہو

کہ جب وہ نظم اور شاعر ....

جہاں بھی ہوں
کسی کو مل نہیں سکتے
گذرتا وقت، پانی اور نظمیں ایک ہی منزل کو
جاتے ہیں

ملاؤ تم ہتھیلی سے ہتھیلی
اور دُعا مانگیں
خداوندا! بہت دن ہو گئے
صحرائے دُنیا پہ کوئی بارش نہیں اُتری
کئی گُم گشتہ بچپن ریت سے
اپنا تعلق توڑ بیٹھے ہیں
نہ کوئی نظم ہوتی ہے
نہ پانی اور نظمیں وقت کے دھارے میں بہتے ہیں
یہ بچپن کتنے برسوں بعد آیا ہے

اگر بارش بھی آ جائے
میں بھیگی ریت پہ اک نظم لکھوں
جو کہ تُم ہو
اور میں بھی ہوں

قمر بشیر کا نوحہ

میں پاک ٹی ہاؤس لاہور میں بیٹھا تھا جب عزیز دوست اور
خوبصورت شاعر قمر بشیر کی حادثاتی موت کی خبر ملی۔ عدنان بیگ اور
میں اُس کا انتظار کرتے رہے کہ شاید وہ زندہ ہو اور کہیں سے
آجائے۔ اُس کے انتظار میں ظاہر ہونے والی بے یقینی سے یہ نظم
شروع ہوتی۔ جو اُس کے لوٹ آنے کی اُمید پر ختم ہوتی ہے
چونکہ عدنان سے گفتگو نظم کا رُخ اختیار کر گئی تھی اس لیے میں
نے یہاں مکالمے کا انداز برقرار رکھا ہے۔

زندگی میں بھی وہ موت کی طرح بے باک تھا

جب مری بات اچھی نہ لگتی اُسے
مُجھ سے کہتا "مرے سامنے جھوٹ بولو نہیں"
یار عدنان! وہ کس طرح مر گیا
حادثے کی خبر اہلِ کنعان ہی لے کے آئے نہ ہوں
کس طرح مان لوں
جس کو شاخوں پہ رہنا گوارا نہ تھا
ریل کی بانجھ پٹڑی پہ وہ کھِل اُٹھا
کس طرح مان لوں
یار عدنان! وہ کس طرح مر گیا
تازہ اخبار میں اُسکی تصویر کے ساتھ جھوٹی خبر
کہیں سچّی نہ ہو
یوں نہ ہو وہ کہیں بیٹھا تازہ غزل کہہ رہا ہو
ہمارے لیے کھانے پینے کا سامان لینے گیا ہو
وہ آئے تو قہوہ بنائے

ہمیں جرعہ جرعہ پلاتے

لطیفے سناتے ہمیں بھی ہنساتے

اگر وہ کہیں رو رہا ہے تو آکر ہمیں بھی رُلائے

اُسکی شب گاہ میں

رتجگے، سسکیاں اور کچھ بھی نہیں

اُسکے ٹیبل پہ رکھی کتابیں اُسے یاد کرنے میں مصروف ہیں

ان سِلے کپڑے درزی کی دُکّان پر منتظر ہی رہے

اور وہ آیا نہیں!

یار عدنان وہ کس طرح مر گیا

مجھ کو یُوں لگ رہا ہے

ابھی وہ کہیں سے نمودار ہوگا

اُٹھائے گا بانہیں، لگائے گا نعرہ کہ میں آگیا

اپنے مرنے کی سچی خبر سُن کے بولے گا

میں تُم سے کتنی دفعہ کہہ چکا ہوں

مرے سامنے جھوٹ بولو نہیں

شجر سے اُترتی ہوئی ایک نظم

مجھے اِک نظم لکھنی ہے

طلوعِ شام سے پہلے

نگر سے دُور جنگل کی اُداسی پر

ہوا کی بے لباسی پر

ہمکتے مور کے قدموں میں بکھرے آنسوؤں پر

نظم لکھنی ہے

مجھے مصرعہ بنانا ہے

کہ جیسے ڈار کونجوں کی فلک کے خالی کاغذ پر

کہ جیسے اشک بستہ ساعتیں
آنکھوں سے صف باندھے نکلتی ہیں
طلوعِ شام سے پہلے

بدن دیمک زدہ لاٹھی
سماعت ملتجی آواز کے در پہ
کہاں مہتاب کی زردی نیا کینوس بناتی ہے
سرشکِ خوں کا خامہ بھی تہی خط ہے
کہاں سے زاویہ کھینچوں
کہاں زنجیرِ بست و در میں مصرعے قید ہوتے ہیں
کوئی حلقہ نہیں ملتا
تماشا سطرِ خستہ کا لہو میں گونج اُٹھا ہے
سُن اے آوازِ بے مسکن
طلوعِ خواب سے پہلے
مجھے اک نظم لکھنی ہے

کبھی بدلی سجل الفاظ کی کشمش گرائے گی
مرا خامہ کوئی نوزائیدہ بچّہ ہے چڑیا کا
عجب بے رزق موسم ہے
اُسے چوگا نہیں ملتا
مرے الفاظ بے موسم پرندوں کی طرح شاخوں پہ بیٹھے ہیں
نہ وہ منقار زیرِ پر
نہ گیتوں سے بھری چونچیں مرے دل میں چبھوتے ہیں
سوادِ شب بھی حسرت ہے
مرے اظہار کی حسرت!
سرِ مہتاب بدلی میں مرے مصرعے چمکتے ہیں
مگر میری حدِ تحریر سے باہر
نہ جانے کون نادیدہ فرشتوں کے پروں پر نظم لکھتا ہے
سُن اے آوازِ بے مسکن
مجھے الفاظ سے بھر دے

مجھے اک نظم لکھنی ہے
سجل لفظوں کی کشمش سے
سوادِ شب کی کڑواہٹ پہ میٹھی نظم لکھنی ہے
طلوعِ خواب سے پہلے

چلو نینا
شجر کے پاس جا کر تالیاں پیٹیں
پرندے جب اُڑیں گے تو زمیں پر نظم اُترے گی

وہ ہنستی ہے تو اُس کے ہاتھ روتے ہیں

کسی کے بعد
اپنے ہاتھوں کی بدصُورتی میں کھو گئی ہے وہ
مجھے کہتی ہے "تابش! تم نے دیکھا میرے ہاتھوں کو
بُرے ہیں ناں؟
اگر یہ خوبصورت تھے تو اِن میں کوئی بوسہ کیوں نہیں ٹھہرا"
عجب لڑکی ہے
پُورے جسم سے کٹ کر فقط ہاتھوں میں زندہ ہے
صراحی دار گردن، نرم ہونٹوں، تیز نظروں سے وہ بدظن ہے

کہ ان اپنوں نے ہی اُس کو سرِ بازار پھینکا تھا
کبھی آنکھوں میں ڈوبی
اور کبھی بستر پہ سلوٹ کی طرح اُبھری
عجب لڑکی ہے
خُود کو ڈھونڈتی ہے
اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں
جہاں وہ تھی نہ ہے، آئندہ بھی شاید نہیں ہوگی

وہ جب اُنگلی گھما کر
فیضؔ کی نظمیں سُناتی ہے
تو اُسکے ہاتھ سے پُورے بدن کا دُکھ جھلکتا ہے
وہ ہنستی ہے تو اُس کے ہاتھ روتے ہیں
عجب لڑکی ہے
پورے جسم سے کٹ کر فقط ہاتھوں میں زندہ ہے

مُجھے کہتی ہے "تابشؔ تُم نے دیکھا میرے ہاتھوں کو
بُرے ہیں ناں ؟"
میں شاید گر چکا ہوں اپنی نظروں سے
میں چُھپنا چاہتا ہوں اُس کے تھیلے میں
جہاں سگریٹ ہیں، ماچس ہے
جو اُس کا حال، ماضی اور مستقبل!

عجب لڑکی ہے
آئے تو خُوشی کی طرح آتی ہے
اُسے مُجھ سے محبت ہے
کہ شاید مجھ میں بھی بدصُورتی ہے اُس کے ہاتھوں کی.

نارسائی کے ساحلوں پر مکاشفہ

سمندر کو معلوم ہے میں بھی ہمراہ اُس کے تجسّس بھری کشتیوں
کی طرح اپنے موہوم کی سرزمینوں کی جانب گیا تھا۔ طلسمی جزیرے،
جزیروں سے اُٹھتا دھواں اور دھویں میں نہاں اک جہاں، اُس
جہاں میں کہیں۔ محلوں کے دریچوں میں بیٹھی حسینائیں۔ لیکن سمندر مرے
ساتھ جاکر بھی مجھ تک رہا۔ اُس کو اپنے جزیروں کی شاید خبر ہی نہیں
تھی۔ میں پانی تھا میری جڑیں مرے اندر رہیں پانیوں کا سفر کیا ؟
تجسّس ہی آغاز ہے اور تجسس ہی انجام ہے۔ اسکے بعد ایک
برگد بھری شام ہے۔

آج کیوں سوچتا ہوں کہ میں بوڑھا برگد نہیں ورنہ بستی سے باہر
تھکے ہارے لوگوں کی رہ دیکھتا، میری چھاؤں میں دو دِل محبّت کا
پیمان کرتے وہ کہتا "تمہارے لیے ہے یہ نٹ کھٹ جوانی"، وہ کہتی
مجھے جانے دے "میری گاگر کی رہ دیکھتا ہوگا پنگھٹ کا پانی"، مسلسل
ملاقاتیں اور ایک لمبی کہانی۔

آج کیوں سوچتا ہوں کہ میں میٹھے پانی کا چشمہ نہیں، گاؤں کے
لوگ میری طرف اپنے کورے گھڑے لے کے آتے۔ وہ کہتا کہ پہلے
مجھے...... اُسکے بعد آنسوؤں کی روانی۔ ... مسلسل ملاقاتیں اور
ایک لمبی کہانی

مجھے گاؤں کے لوگ ہی جانتے ہیں نہ میری شناسائی برگد بھری
شام سے، شام ہے اور سورج کی گاگر سمندر سے بچہ کوئی بھر رہا
ہے۔ یہاں میں بھی آیا ہوں اپنے کسی کام سے۔

محبّت کا مرض تو اُس نے لاحق کر دیا ہم کو
مگر حسبِ ضرورت مبتلا ہونے نہیں دیتا

○

بیاں اپنی حقیقت کر رہا ہوں
وہ کہتے ہیں شکایت کر رہا ہوں

کبھی اُن سے کہی تھی بات کوئی
مگر اب تک وضاحت کر رہا ہوں

بلا مقصد نہیں یہ دیکھنا بھی
کسی کو خوبصورت کر رھا ہوں